عقدِ ذمہ کی آئینی وشرعی حیثیت

حافظ محمد سعد اللہ *

اسلامی ریاست میں غیر مسلم رعایا کیلئے عموماً جو اصطلاح استعمال ہوتی ہے وہ ''اھل الذمہ'' یا ''ذمی'' کی ہے۔ ان الفاظ کے اندر اتنی جامعیت اتنی معنویت اتنی فصاحت و بلاغت اور اتنی گہرائی موجود ہے کہ یہ الفاظ ہی اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے معاشرتی مرتبہ ومقام عزت واحترام اور ان کے تمام حقوق (جن کی وضاحت آگے آرہی ہے) کا ایک طرح سے تعین کر دیتے ہیں۔ اسی معنویت کو دیکھتے ہوئے مولانا مودودی نے لکھا ہے:

> ذمی کوئی گالی نہیں ہے اور نہ یہ لفظ شودر اور ملیچھ کا ہم معنی ہے۔ ذمہ عربی زبان میں (Guarantee) کو کہتے ہیں اور ذمی وہ شخص ہے جس کے حقوق ادا کرنے اور محفوظ رکھنے کا اسلامی حکومت نے ذمہ لیا ہو۔(۱)

اسی طرح مولانا مناظر احسن گیلانی ذمی کے لفظ میں پنہاں معنویت کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

> ''مسلمانوں کے عہد حکومت کی غیر مسلم رعایا جن کا اصطلاحی نام ذمی ہے۔ ذمی کے اس لفظ کو بلا وجہ رسوا کرنیکی کوشش جو کی گئی ہے اور ایسے مہیب تصورات کو اس کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے کہ شاید خود مسلمانوں کو بھی اس لفظ کے استعمال میں گونہ شرمندگی سی محسوس ہونے لگی ہے۔ حالانکہ اس لفظ ہی میں کوئی بات ایسی نہیں جو مسلمانوں کیلئے باعث ندامت ہو۔ اردو میں بھی ذمہ کا عربی لفظ مستعمل ہے۔ مسلمانوں کی حکومت غیر مسلم اقوام کے جن لوگوں کی عزت جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہے، ذمہ کے لفظ کے ساتھ نسبت کی ''ی'' کا اضافہ کر کے ذمی کا لفظ بنا لیا گیا ہے اور رعایا کے اس طبقہ کی تعبیر اس سے کی جاتی ہے۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ اس میں مسلمانوں کیلئے شرمانے کی کیا بات ہے۔(۲)

عقدِ ذمہ کی تعریف

چنانچہ ذمی کا لفظ لغوی اعتبار سے ''ذمۃ'' سے ماخوذ ہے اور لفظ ''ذمہ'' عہد، ضمانت، کفالت، امان، حرمت،

* پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان

ذمہ داری، حق کے معنوں میں آتا ہے اسی وجہ سے اھل العہد (جو لوگ باقاعدہ ایک معاہدے کے تحت اسلامی ریاست کی اطاعت قبول کرتے ہیں) کو اھل الذمہ کہا جاتا ہے اور وہ اصطلاح میں وہ تمام مشرکین ہیں جو اسلامی ریاست کو جزیہ دینا قبول کر لیتے ہیں اور ''رجل ذمی'' (ذمی آدمی) کے معنی ہیں ''رجل لہ عہد'' یعنی وہ شخص جس سے اسلامی ریاست کا کوئی عہد و پیمان ہو۔ اور اھل الذمہ کو ذمی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اہل اسلام کے عہد اور امان میں داخل ہو جاتے ہیں: لدخولھم فی عھد المسلمین وامانھم۔(۳)

اصطلاح میں ''ذمہ'' وہ ذمہ داری ہے جو اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا کی جان، مال، عزت و حرمت کے تحفظ کے سلسلے میں اپنے اوپر لیتی ہے۔ اسلامی ریاست کی غیر مسلم رعایا کو ذمی یا اھل الذمہ کہا جاتا ہے۔ گویا یہ وہ لوگ ہیں جن کے جان و مال اور عزت و آبرو اور شہری حقوق کی حفاظت کا اسلامی حکومت نے ذمہ لیا ہے۔(۴)

یہ ذمہ داری بڑی ہی مقدس چیز ہے۔ محمد علی تھانوی نے قاضی امام ابوزید کے حوالے سے لکھا ہے:

ان الذمة شرعا وصف یصیر به الانسان اهلا لما له ولما علیه۔(۵)

بیشک ذمہ شرعی اعتبار سے وہ وصف ہے جس کے ذریعے انسان اپنے حقوق اور اپنے فرائض کا اھل ہو جاتا ہے۔

گزشتہ تفصیل سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں ذمہ کے لفظ میں ذم یا تحقیر کا پہلو نہیں بلکہ اس میں ذمی کی ہر طرح سے حفاظت کی ضمانت اور اس کے تمام حقوق کے تحفظ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اسی ذیل میں کہا گیا ہے:

الذمة هی الامان لهذا سمی المعاهدذمیا لانه اعطی الامان علی ذمة الجزیة التی تؤخذمنه۔(۶)

ذمہ کے معنی امان کے ہیں اسی وجہ سے معاہد کو ذمی کہا جاتا ہے اسلیے کہ جو جزیہ اس سے لیا جاتا ہے اس کی بنیاد پر اسے امان دی گئی ہے۔

اسی کے مادہ سے ''ذمام'' کا لفظ آتا ہے جس کی تشریح صاحب لسان العرب نے یوں کی ہے:

الذمام کل حرمة تلزمك اذا ضیعتها المذمة ومن ذالك سمی اهل العهد اهل الذمة۔(۷)

ذمام ہر محترم چیز کو کہا جاتا ہے کہ جب تو اسے ضائع کر دے تو قابل مذمت ٹھہرے اور اسی معنی میں اھل العہد کو اہل الذمہ کہا جاتا ہے (کہ انکے حقوق کی عدم ادائیگی بھی قابل مذمت ہے)

جبکہ المنجد میں مادہ ذمم کے تحت ذمی کی تعریف ان الفاظ میں ہے:

الذی اعطی الذمة ای الامان یعنی الذی امن علی ماله وعرضه ودمه۔(۸)

ذمی وہ شخص ہے جسے ایسا عہد و پیمان دیا گیا ہو کہ جس کے باعث وہ اپنے مال اپنی عزت وآبرو اور اپنی جان کے بارے میں مامون ومحفوظ ہو جاتا ہے۔

عقدِ ذمہ کی آئینی حیثیت

یہ عقدِ ذمہ یا عہد و پیمان کیا محض رسمی، دکھاوے کی اور کاغذی کاروائی ہوتی ہے یا اسکی کوئی آئینی حیثیت اور اہمیت و وقعت بھی ہوتی ہے؟ اس کا اندازہ ایک تو حضرت عمر فاروقؓ کی اس وصیت سے ہو جاتا ہے جو آپ نے شہادت کے وقت اپنے مابعد خلیفہ کو ذمیوں سے متعلق کی تھی۔ آپ نے فرمایا:

واوصیه بذمة الله وذمة رسوله ﷺان یوفی لهم بعهدهم وان یقاتل من وارئهم ولا یکلفو الاطاقتهم۔(۹)

میں اسے وصیت کرتا ہوں کہ اہل الذمہ کو اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف سے جو ذمہ دیا گیا ہے اس کی حفاظت کرے، ان سے جو عہد کیا گیا ہے اسے پورا کرے، ان پر حملہ ہو تو ان کے دفاع میں جنگ کرے اور ان پر اتنا ہی بوجھ (جزیہ) ڈالے جتنا کہ وہ اٹھا سکیں۔

اسلام میں عقدِ ذمہ کی کیا آئینی حیثیت ہے اسے پورا کرنا کس قدر ضروری ہے اس کے بارے میں مشہور حنفی فقیہ علامہ ابو بکر الکاسانی نے عقدِ ذمہ کی صفت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جہاں تک عقدِ ذمہ کی صفت کا تعلق ہے تو وہ یہ ہے کہ یہ ہمارے (اہل اسلام کے) حق میں تو لازم ہے کہ مسلمان اسے توڑنے کا کسی حال میں بھی اختیار نہیں رکھتے۔ البتہ ذمیوں کے حق میں یہ لازم نہیں ہے تاہم فی الجملہ یہ ٹوٹنے کا احتمال رکھتا ہے لیکن یہ صرف تین امور میں سے کسی ایک امر سے ہی ٹوٹ سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ذمی اسلام قبول کر لے کیونکہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے عقدِ ذمہ تو قبول اسلام کے وسیلے کے طور پر باندھا جاتا ہے اور اس کے اسلام قبول کرنے سے یہ مقصود حاصل ہو گیا۔ دوسرا امر یہ ہے کہ وہ دارالحرب سے جا ملے کیونکہ دارالحرب سے جا ملنے سے وہ بمنزلہ مرتد کے ہو جاتا ہے۔ تیسرا امر یہ ہے کہ وہ کسی علاقہ پر غلبہ حاصل کر لیں اور مسلمانوں سے لڑنا شروع کر دیں کیونکہ ایسا کرنے سے وہ اہل حرب ہو جاتے ہیں اور معاہدہ لامحالہ ٹوٹ جاتا ہے۔''

یہ عقدِ ذمہ اسلام میں کس قدر مضبوط ہوتا ہے اور اسلامی ریاست اس کی کس حد تک پابند ہے؟ اس سلسلے

میں علامہ کاسانی نے مزید لکھا ہے کہ:

''اگر کوئی ذمی جزیہ دینے سے انکار کر دے تو بھی یہ عہد نہیں ٹوٹے گا۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس کا انکار مال نہ ہونے کے عذر کی وجہ سے ہو۔ لہٰذا شک اور احتمال کے ہوتے ہوئے معاہدہ نہیں ٹوٹے گا۔ اسی طرح اگر وہ نبی کریم ﷺ کی شان میں سب وشتم کرے تو بھی معاہدہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ یہ تو کفر پر کفر کا اضافہ ہے۔ اور معاہدہ اگر اصل کفر کیساتھ باقی رہتا ہے تو کفر کے اضافے کے ساتھ بھی باقی رہے گا۔ اسی طرح اگر وہ کسی مسلمان کو قتل کر دے یا کسی مسلمان عورت سے زنا کا مرتکب ہو تو بھی معاہدہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ یہ جو گناہ ہیں جن کا اس نے ارتکاب کیا یہ قباحت اور حرمت میں کفر سے تو کمتر ہیں تو جب کفر کے ساتھ عقد ذمہ باقی رہتا ہے تو معصیت کے ساتھ بدرجہ اولیٰ باقی رہے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم''۔(۱۰)

عقد ذمہ کی اس قدر اہمیت اور اس قدر پاس اس لیے ہے کہ اسلامی ریاست اہل الذمہ سے جو معاہدہ کرتی ہے تو وہ نائب الٰہی بن کر کرتی ہے اور اس کا اہل الذمہ سے معاہدہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے نام پر ایک معاہدہ ہوتا ہے۔اس معاہدہ کا پورا کرنا اس کیلئے ضروری ہے۔وہ ان کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری لیتی ہے۔اس ذمہ داری کو اسے ہر قیمت پر ادا کرنا ہوگا۔حتیٰ کہ ان کے تحفظ کیلئے اسے دشمن سے جنگ بھی کرنی پڑے تو اس سے گریز نہ کرے۔سید مودودی نے ذمی کی تعریف کے ضمن میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

''اسلامی حکومت یہ ذمہ محض اپنی طرف سے یا مسلم باشندوں کی طرف سے نہیں بلکہ خدا اور رسول کی طرف سے لیتی ہے اور اس کی اہمیت اس درجے کی ہے کہ اگر کسی غیر مسلم حکومت میں مسلمانوں کا قتل عام بھی کر ڈالا جائے تو ہم انتقاماً اپنے ملک میں اس کے ہم مذہب ذمیوں کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ایک اسلامی حکومت میں کوئی پارلیمنٹ ان کے شرعی حقوق غصب کرنے کی سرے سے مجاز ہی نہیں ہے۔(۱۱)

عقد ذمہ کے ذریعے اسلامی ریاست اہل الذمہ کے جن حقوق کا ذمہ اٹھاتی اور جنکی تفصیل آگے آرہی ہے۔ان کی آئینی حیثیت اور شریعت میں ان کے مرتبہ ومقام کے متعلق مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

''جو حقوق یہاں بیان کیے جارہے ہیں ان کی حیثیت دنیا کے عام دستوری تحفظات کی سی نہیں ہے کیونکہ ایسے تحفظات میں سے اکثر کی اول تو کتاب دستور کی زینت ہونے سے زیادہ کوئی قیمت ہی نہیں ہوتی۔اگر ہوتی بھی ہے تو اسی وقت تک اور اسی حد تک جس تک حکومت کی حکمت عملی اور

اغراض کیلئے ضروری یا مفید ہو۔ یہ سارے حقوق اسلامی شریعت کے اسی طرح اجزاء ہیں جس طرح خدا اور رسول کے عائد کردہ دوسرے فرائض اور واجبات اس لیے ان کا بہر شکل اور بہر حال قائم رکھنا اسلامی حکومت کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح شریعت کے دوسرے احکام وواجبات کا۔ اگر ان میں سے کسی حق کو بھی بغیر کسی واقعی عذر کے ضائع کیا گیا تو اسلامی ریاست صرف اس زمین ہی پر اس کے لیے جوابدہ نہیں بلکہ اسکے بعد اسکی اصل جوابدھی خدا کے سامنے ہے اور وہاں اس مقدمہ میں مظلوم اھل ذمہ کے وکیل جیسا کہ احادیث میں تصریح ہے، خود محمد رسول اللہ ﷺ ہوں گے۔

ذمیوں کو یہ حقوق مسلمانوں یا ان کی حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ خدا اور اسکے رسول ﷺ کی طرف سے اور ان کی ضمانت پر دیے جاتے ہیں۔ ان کی ادائیگی میں دانستہ اور بلا عذر کوتاہی خدا اور رسول سے خیانت اور غداری ہوگی۔ ذمیوں کے یہ حقوق کم سے کم ہیں۔ خدا اور رسول ﷺ کی طرف سے عطا کیے جانے کی وجہ سے ان میں ذرا سی کمی کرنے کا بھی کسی اسلامی حکومت کو حق نہیں ہے۔ ان سے زیادہ وہ جو چاہے دے مگر ان میں سے کوئی حق کم کرنیکی وہ مجاز نہیں''۔ (۱۲)

عالمی منشور انسانی حقوق کی آئینی حیثیت تقابلی جائزہ:

اسلام میں عقد ذمہ کے ذریعے اھل ذمہ کو جو انسانی اور شہری حقوق دیے جاتے ہیں ان کی آئینی قانونی اور شرعی حیثیت کے مختصر جائزہ لینے کے بعد مناسب ہوگا کہ اقوام متحدہ کے معروف ''عالمی منشور انسانی حقوق'' (Universal Declaration of Human Rights) مجریہ 10 دسمبر 1948ء کی حقیقت اور آئینی حیثیت کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔ تاکہ اللہ اور رسول ﷺ یا دوسرے لفظوں میں اسلام کے عطا کردہ انسانی حقوق اور مفاد پرست اقوام کے دیے گئے نام نہاد انسانی حقوق کے درمیان بنیادی فرق وامتیاز کا اندازہ لگایا جاسکے۔

مولانا مودودی رحمہ اللہ نے دور حاضر میں انسانی حقوق کے شعور کی ارتقائی تاریخ پر اجمالی نظر ڈالتے ہوئے آخر میں اقوام متحدہ کی طرف سے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ کو پاس ہونیوالے عالمی منشور حقوق انسانی کا تذکرہ کیا ہے۔ اوراس کے بعد اسکی آئینی وقانونی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''اس پورے منشور کے کسی جزء سے کوئی اختلاف کسی بھی قوم کے نمائندوں نے نہیں کیا۔ اختلاف نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ صرف عام اصولوں کا اعلان واظہار تھا۔ کسی نوعیت کی پابندی کسی پر بھی عائد نہ ہوتی تھی۔ یہ کوئی معاہدہ نہیں ہے جس کی بنا پر دستخط کرنیوالی تمام حکومتیں اسکی پابندی پر مجبور

ہوں اور بین الاقوامی قانون کے مطابق ان پر قانونی وجوب عاید ہوتا ہو۔ اس میں واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ یہ ایک معیار ہے جس تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے پھر بھی بعض ملکوں نے اس کے حق میں یا اس کے حق میں یا اس کے خلاف ووٹ دینے سے اجتناب کیا۔

اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اول مغربی دنیا میں انسانی حقوق کا تصور ہی دو تین صدیوں سے پہلے اپنی کوئی تاریخ نہیں رکھتا۔ دوسرے اگر آج ان حقوق کا ذکر کیا بھی جائے تو ان کے پیچھے کوئی سند (Authority) اور کوئی قوت نافذہ (Sanction) نہیں ہے۔ بلکہ یہ صرف خوشنما خواہشات ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اسلام نے حقوق انسانی کا جو منشور قرآن میں دیا اور جس کا خلاصہ حضور نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر نشر فرمایا وہ اس سے قدیم تر بھی ہے اور ملت اسلامیہ کیلئے اعتقاد، اخلاق اور مذہب کی حیثیت سے واجب الاتباع بھی۔ پھر ان حقوق کو عملاً قائم کرنیکی نظیریں بھی حضور پاک ﷺ اور خلفائے راشدین نے چھوڑی ہیں۔'' (۱۳)

اسی طرح جناب صلاح الدین نے عالمی منشور حقوق انسانی کی ''تمیں دفعات'' کی دفعہ وار تفصیل اور اندارج کے بعد اس منشور کی حقیقت اور اقوام متحدہ کی بے بسی پر متعدد مغربی مفکرین کی آراء اور تبصرہ جات درج کیے ہیں اور آخر میں اسکی آئینی وقعت وحیثیت اور اصلیت سے یوں پردہ اٹھاتے ہیں:

منشور انسانی حقوق کے مطالعہ اور اس پر کیے گئے تبصروں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بین الاقوامی سطح پر انسان کی اجتماعی کوششیں بھی اس کے لیے پروقار اور آبرومندانہ زندگی کو کوئی ضمانت مہیا نہیں کر سکیں۔ وہ اپنے اپنے ملک میں حکومتوں کی قہرمانی کے سامنے جتنا بے بس دبے اختیار پہلے تھا اتنا ہی آج بھی ہے بلکہ حکومتوں کے دائرہ کار اور اس کے اختیارات میں مسلسل وسعت واضافے نے بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں کو بالکل بے معنی بنا دیا ہے۔ منشور انسانی حقوق کی حیثیت ایک خوشنما دستاویز سے زیادہ کچھ نہیں اس میں حقوق کی ایک فہرست تو مرتب کر دی گئی ہے لیکن ان میں سے کوئی ایک حق بھی اپنے پیچھے قوت نافذہ نہیں رکھتا۔ یہ نہ ریاستوں پر کوئی قانونی پابندی عائد کر کے انہیں بنیادی حقوق سلب کر لینے سے باز رکھنے کا کوئی اہتمام کرتا ہے اور نہ کسی فرد کے غصب شدہ حقوق کی بازیابی کے لیے کسی قانونی چارہ جوئی کا کوئی نظام مہیا کرتا ہے۔ اسطرح یہ منشور تحفظ انسانی حقوق کے معاملہ میں بالکل ناکارہ اور ناقابل اعتماد دستاویز ہے۔ اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس اتنا ہے کہ اس نے انسانی حقوق کا ایک معیار قائم کر دیا ہے وہ عالمی انسانی برادری کو اپنے حقوق کے تحفظ کا ارتقائی احساس وشعور بخشتا ہے۔ معاشرہ میں فرد کی اہمیت پر زور دیا ہے اورا

س کی مدد سے نو آزاد ممالک اپنے آئین وضع کرتے وقت بنیادی حقوق کے رسمی باب کو سہولت کے ساتھ مرتب کر لیتے ہیں۔اس منشور کی حیثیت سراسر اخلاقی ہے۔قانونی نقطہ نظر سے اس کا کوئی وزن و مقام نہیں۔ بنیادی حقوق کے محافظ کی حیثیت سے اس منشور کی قوت واہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف سیاسی قیدیوں کے معاملات سے متعلق بین الاقوامی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل (Amnesty International) کی شائع شدہ رپورٹ برائے سال ۷۶-۱۹۷۵ کے مطابق اقوام متحدہ کے ۱۴۲ رکن ممالک میں سے ۱۱۳ ملکوں میں بنیادی حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں کی گئیں اور طاقت کے بیجا استعمال' بلا جواز گرفتاریوں' سیاسی قید و بند' جبر وتشدد اور سزائے موت کے واقعات اور پریس پر پابندی' عدلیہ کے اختیارات میں کمی' آمرانہ قوانین کے نفاذ اور بنیادی حقوق منسوخ و معطل کئے جانے کے اقدامات میں عالمگیر سطح پر تشویش ناک اضافہ ہوا ہے۔(۱۴)

عصر حاضر میں ذمی کی اصطلاح کا مسئلہ

پاکستان سمیت تمام اسلامی ممالک میں اس وقت جتنے غیر مسلم لوگ آباد ہیں آیا ان کیلئے ذمی کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے۔یا نہیں اس سلسلے میں موجودہ بین الاقوامی صورت حال اور سوچ کچھ اس طرح کی ہے کہ شرعی اصطلاح میں ذمی کا لفظ جیسا کہ اوپر گزرا چاہے کتنا با معنی مقدس اور ذمہ داری وحفاظت کا مفہوم لیے ہوئے ہو اور اس میں ذلت وتحقیر کے معنی کی مسلمان جتنی نفی کریں غیر مسلم اس لفظ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ذمی کے تصور سے وہ دوسرے درجے کے شہری قرار پاتے ہیں۔

علاوہ ازیں تمام اسلامی ممالک میں غیر مسلم اقلیتوں کو استعماری طاقتوں کی تائید وحمایت حاصل ہے دوسری طرف اسلامی ممالک کی سیاسی وعسکری اور معاشی صورت حال بھی سراسر استعماری طاقتوں کے رحم وکرم پر منحصر ہے۔ ارباب اختیار و اقتدار میں ایمانی جرات اور حمیت و غیرت کا جذبہ بھی قابل رحم حد تک مفقود ہے اس لئے "الضرورات تبیح المحذورات"۔(۱۵)(مجبوریاں ممنوع چیزوں کو بھی جائز قرار دے دیتی ہیں) کے مسلمہ فقہی قاعدہ کی رو سے ضروری نہیں کہ ان حالات میں غیر مسلموں کیلئے ''ذمی'' کی اصطلاح پر ہی زور دیا جائے۔ذمی کی مذکورہ تعریف کے مطابق اگر وہ اللہ اور اسکے رسول کے ذمہ میں نہیں آنا چاہتے تو یہ انکی صوابدید ہے۔اس کے علاوہ اسلام لفظوں میں الجھنے کی بجائے اصل مقصد کو ترجیح دیتا ہے۔چنانچہ صلح حدیبیہ کے معاہدہ میں اہل مکہ کے نمائندے نے ''محمد رسول اللہ ﷺ'' کے الفاظ پر اعتراض کیا تو آپ ﷺ نے ان الفاظ پر زور نہیں دیا بلکہ اسکی رائے کے مطابق

کاتب معاہدہ حضرت علی المرتضیٰؓ کے نہ چاہنے کے باوجود اپنے ہاتھ سے محمد بن عبداللہ لکھ دیا اور یوں اس معاہدہ صلح کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔(۱۶)

موجودہ حالات میں غیر مسلموں کیلئے ذمی کی اصطلاح کیلئے اصرار نہ کرنے پر خلیفہ راشد حضرت عمر فاروق کے اس فیصلے سے بھی استشہاد کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے نصاری بنی تغلب کی خواہش پر ان سے جزیہ کی بجائے دوگنا صدقہ (زکوۃ) لینے پر صلح کر لی تھی۔(۱۷)

غیر مسلموں کے بارے میں ''اشداء علی الکفار'' کی شان کے حامل خلیفہ حضرت عمرؓ نے بنی تغلب سے جزیہ کی بجائے دوگنی زکوۃ پر صلح کیوں فرمائی اس کی حکمت ومصلحت سے پر تبصرہ کرتے ہوئے ابوعبید نے لکھا ہے:

> ''ہمارے خیال میں انہوں نے جزیہ کا نام اڑا کر یہ صورت اسلیے جائز رکھی کہ انہیں بنی تغلب کی طرف سے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ وہ جزیہ کے نام سے بیزاری، ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں اور وہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ اگر انہیں (اسی نام پر) مجبور کیا گیا تو وہ رومیوں سے جا ملیں گے اور اسلام کے خلاف ان کے مددگار بن جائیں گے۔پھر ان پر یہ حقیقت بھی منکشف تھی کہ اگر ان سے واجبی جزیہ لینے کے ساتھ ہی اتنی رعایت کر دی جائے کہ اس کا نام (جزیہ) باقی نہ رکھا جائے تو اس سے مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچے گا۔ بنابریں انہوں نے ان کے لیے جزیہ کا لفظ اڑا دیا اور اسکی واجب الادا رقم صدقہ کے نام سے لینے لگے جو مسلمانوں سے وصول کی جانے والی زکوۃ سے دوگنی ہوتی تھی۔ اس طرح ایک طرف تو ان کے مخالفین سے جا ملنے کے اندیشہ کا سد باب ہو گیا اور دوسری طرف ان کے ذمہ مسلمانوں کے جو واجب الادا حقوق تھے وہ بھی پورے پورے وصول ہو گئے۔اور اس فیصلہ میں حضرت عمر صائب الرائے اور اپنی جگہ بالکل حق بجانب تھے۔(۱۸)

بالکل یہی صورت حال عالم اسلام میں غیر مسلموں کیلئے ذمی کی اصطلاح استعمال کرنے میں ہے۔لہٰذا ان کے لئے غلبہ اسلام کے زمانے کی مذکورہ اصطلاح پر زور دینے کی بجائے ''غیر مسلم اقلیت'' کی اصطلاح استعمال کرنے میں شرعاً کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا۔

عقد ذِمہ کا حکم

جب اسلامی ریاست کسی غیر مسلم فرد یا قوم سے ''عقد ذمہ'' کا باقاعدہ معاہدہ کر لے تو علامہ کاسانی کہتے ہیں کہ اس کا فوری اثر یا نافذ العمل حکم ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم ''قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الاخر۔۔۔۔حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون'' کی رو سے ان اہل الذمہ کی جانیں محفوظ ہو جائیں

گی۔ کیونکہ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے جزیہ قبول کر لینے کے وقت تک ان سے جنگ کرنے کو مباح ٹھہرایا ہے۔ جب انہوں نے جزیہ دینا منظور کرلیا تو جنگ کی اباحت ختم ہوگئی۔ جب جنگ کی اباحت ختم ہوگئی تو از خود ان کی جانوں کی عصمت ثابت ہوگئی۔ اور اس عقد ذمہ کا دوسرا نافذ العمل حکم یہ ہے کہ ان کے مال بھی معصوم ومحفوظ ہو جائیں گے کیونکہ مال نفس کی عصمت کے تابع ہے۔ علاوہ ازیں حضرت سیدنا علی المرتضیٰؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

انما قبلوا عقد الذمة لتكون اموالهم كا موالنا ودماء هم كد مائنا ۔(۱۹)

بیشک ان لوگوں نے عقد ذمہ اس لیے قبول (منظور) کیا ہے کہ ان کے اموال ہمارے اموال کی طرح اور ان کے خون ہمارے خونوں کی طرح محفوظ ومعصوم ہو جائیں۔

عقد ذمہ کی مشروعیت کی حکمت

گزشتہ صفحات میں یہ وضاحت گزر چکی ہے کہ جب کوئی غیر مسلم قوم اسلامی ریاست کو ''جزیہ'' کی شکل میں ایک معمولی ٹیکس دینا منظور کر لیتی ہے تو از روئے قرآن اسلامی ریاست اس امر کی پابند ہے کہ اس سے جنگ نہ کرے اس پر کسی ظاہر پرست اور معترض کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جزیہ کا وجوب یا عقد ذمہ کی مشروعیت تو غیر مسلموں کے کفر پر راضی رہنے کے مترادف اور ان سے جزیہ کی شکل میں مال وصول کرنے کیلئے ہے۔ فقہائے اسلام کی دور بین اور باریک بین نگاہوں سے یہ شبہ اوجھل نہیں رہا۔ لہذا اس شبہ کا جواب دیتے ہوئے ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ اس سے مقصود محض جزیہ وصول کرنا نہیں بلکہ انہیں اس بات کی مہلت اور موقع دینا مطلوب ہے کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کے محاسن پر غور کریں اور اسلام قبول کر لیں۔ چنانچہ مشہور فقیہ مفسر ابن العربی نے جزیہ کی مشروعیت کی ایک حکمت یہ لکھی ہے کہ:

"انه لو قتل الكافرليئس من الفلاح ووجب عليه الهلكة فاذا اعطى الجزية وامهل لعله ان يتد براالحق ويرجع الى الصواب لا سيما بمراقبة اهل الدين والتدرب بسماع ما عند المسلمين الاترى ان عظيم كفرهم لم يمنع من ادرار رزقه سبحانه عليهم وقد قال النبی ﷺ لااحد اصبر على اذى من الله يعافيم ويرزقهم وهم يدعون له الصاحبة والولد"۔(۲۰)

اگر کافر کو قتل کر دیا جائے (اور جزیہ قبول کر کے اسے زندہ رہنے کا موقع نہ دیا جائے) تو یقیناً یہ اخروی کامیابی سے مایوس ہو جائے گا اور ہلاکت اس پر واجب ہو جائے گی۔ مگر جب اس نے جزیہ دے دیا اور یوں مہلت

حاصل کر لی تو ہوسکتا ہے کہ وہ دین حق میں غور فکر کرے اور سیدھے راستے (دین اسلام) کی طرف لوٹ آئے خصوصاً جب کہ وہ اہل دین کی زندگی کو دیکھے گا اور مسلمانوں کے ہاں موجود شرعی احکام کو ایک عرصہ تک سنے گا (تو یقیناً اسکی ہدایت کی امید کی جاسکتی ہے۔ جہاں تک اسکے کفر پہ راضی ہونیکا اشکال ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ کریم سے بڑھ کر اذیت پر صبر کرنے والا دنیا میں کوئی نہیں۔ وہ کفار سے درگزر کرتا اور انہیں مسلسل رزق دے رہا ہے، حالانکہ وہ اس کے لیے بیوی اور اولاد ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔

اسی طرح علامہ کاسانی نے اہل الکتاب اور دوسرے غیر مسلموں سے عقد ذمہ کرنے کی بنیادی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''عقد ذمہ کے بعد انہیں جو اپنے حال (کفر) پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور ان سے جزیہ قبول کر لیا جاتا ہے تو اس میں ان سے جو جزیہ لیا جاتا ہے اس کی رغبت اور طمع مدنظر نہیں بلکہ اسلام کی طرف دعوت کی خاطر یہ معاہدہ کیا جاتا ہے تاکہ وہ لوگ جب مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر رہیں گے تو اسلام کے محاسن اور اسکے شرعی احکام میں تامل اور غور وفکر کریں گے اور دیکھیں گے کہ یہ وہ احکام ہیں جنہیں انسانی عقل بھی قبول کرتی ہے تو یہ چیز انہیں اسلام کی طرف دعوت دے گی اور وہ اسکی رغبت کریں گے تو یہ عقد ذمہ ان کے اسلام قبول کر لینے کی امید پر مشروع کیا گیا ہے۔(۲۱)

علی ہذا القیاس علامہ سرخسی نے لکھا ہے کہ:

''اہل حرب میں سے کوئی قوم اگر یہ مطالبہ کرے کہ وہ مقررہ جزیہ اور خراج ادا کرنے کی شرط پر مسلمانوں کی ذمی بننے اور اپنے اوپر اسلامی احکام کا نفاذ قبول کرنے کیلئے تیار ہے تو خلیفہ پر واجب ہے کہ وہ انکی اس دعوت کو قبول کرے۔ کیونکہ جس طرح محاربین کے اسلام قبول کر لینے پر ان سے جنگ کا حکم ختم ہو جاتا ہے اسی طرح ان کے عقد ذمہ سے بھی جنگ ختم ہو جاتی ہے۔ پھر جس طرح اگر وہ یہ مطالبہ کریں کہ ان پر اسلام پیش کیا جائے تو انکی یہ دعوت قبول کرنا واجب ہے اسی طرح اگر وہ عقد ذمہ کا مطالبہ کریں تو انکی دعوت قبول کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس طریقے سے وہ باہمی معاملات میں احکام اسلام کی پابندی کریں گے تو ہوسکتا ہے کہ وہ شریعت کے محاسن دیکھیں اور اسلام لے آئیں تو گویا یہ عقد ذمہ مناسب طریقہ پر دین کی طرف بلانے کے معنی میں ہے۔(۲۲)

زیر بحث اشکال وشبہ کا جواب علامہ قرافی نے بہت عمدہ اور بڑے اصولی انداز میں دیا ہے انہوں نے پہلے اس معاملے میں دین کے اندر طعن کرنیوالے بعض لوگوں کی طرف سے یہ سوال اٹھایا ہے کہ ''شریعت اسلامیہ کی شان

یا عمومی اصول تو یہ ہے کہ ناگزیز مفاسد میں سے چھوٹے مفسدہ کو برداشت کر کے بڑے مفسدہ کو دور کیا جاتا اور بڑے مفسدہ کے دور کرنے کی خاطر دینوی مصلحت کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔مگر یہاں اس شرعی اصول کے برعکس معاملہ ہے وہ اس طرح کہ کفار کے اموال میں سے جزیہ کی صورت میں معمولی مفاد اٹھا کر کفر جیسی عظیم خرابی کو بڑھنے کا موقع دیا جاتا ہے بلکہ یہ کفر تو وہ خرابی ہے جسے دنیا و مافیہا کے بدلے بھی ختم کیا جانا چاہئے چہ جائیکہ جزیہ کے اس معمولی مفاد کی خاطر کفر کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے۔تو شریعت میں اس کا حکم کیوں وارد ہوا اور اسے کیوں نہیں منع کیا گیا ہے؟ تو اس سوال کا جواب دیتے ہوئے علامہ قرافیؒ نے لکھا ہے:

(طوالت کے خوف سے ہم یہاں صرف اردو ترجمہ پر اکتفا کر رہے ہیں)

''دراصل جزیہ کا قاعدہ بڑے مفسدہ کے دفعیہ اور بڑی مصلحت کے حصول کیلئے چھوٹی خرابی کو اختیار کرنے کے باب سے ہے اور یہی قواعد شرعیہ کی شان اور اصول ہے۔اس جمال کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ جب کافر کو قتل کر دیا جائے گا تو اس پر ایمان اور جنت کی سعادت حاصل کرنے کا دروازہ بند ہو جائے گا اور حتمی طور پر اس پر کفر اور ہمیشہ کیلئے جہنم کی آگ میں جلنے اور دین کی ناراضگی کا فیصلہ کر دیا جائے گا لہذا اللہ کریم نے اس امید پر جزیہ مشروع فرمایا کہ شاید وہ آنے والے وقت میں دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے۔جب اسے اسلام کے محاسن کا پتہ لگے گا اور جزیہ کی وصولی میں اسے ذلت وخواری پر مجبور ہونا پڑے گا تو بطور خاص اس کے اسلام لانے کی امید کی جاسکتی ہے۔پھر جب اس نے اسلام قبول کر لیا تو اس کے اسلام لانے سے اسکی ذریت (اولاد) بھی اسلام لے آئے گی۔پھر اس طرح اس کی طرف سے کفر کی بجائے اسلام کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔اور بالفرض اگر وہ خود اپنے کفر پر ہی مر گیا اور اسلام نہیں لے آیا تو ہم توقع رکھتے ہیں کہ اس کے بعد باقی رہنے والی اس کی اولاد اسلام قبول کر لے گی اور اسی طرح قیامت تک اسکی اولاد در اولاد سے اسلام کی توقع کی جاسکتی ہے۔اور ایمان کی ایک گھڑی بھی کفر کے طویل زمانہ کے برابر ہے۔'' (۲۳)

عقد ذمہ کی مذکورہ غرض وغایت کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جونہی کوئی ذمی آدمی اسلام قبول کرے تو شرعی اعتبار سے جزیہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے۔(۲۴)

اسی طرح بعض اموی حکمران (آل مروان) اھل الذمہ میں سے اسلام قبول کرنے والوں سے بھی اس نقطہ نظر سے جزیہ لیتے رہے تھے کہ یہ ایک شخصی ٹیکس ہے جو کسی کے اسلام قبول کر لینے سے ساقط نہیں ہوتا مگر جب

حضرت عمر بن عبدالعزیز والیٔ خلافت ہوئے تو یہ صورت حال دیکھتے ہوئے آپ نے عراق میں اپنے عامل عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو سلام کے بعد لکھا:

اما بعد فان اللّٰہ بعث محمد اداعیاولم یبعثہ جابیا، فاذا اتاك کتابی ھذا فارفع الجزیة عمن اسلم من اھل الذمة۔(۲۵)

اما بعد، بیشک اللہ نے حضرت محمد ﷺ کو داعی بنا کر مبعوث فرمایا تھا نہ کہ ٹیکس وصول کرنیوالا بنا کر۔ لہٰذا جب تمہارے پاس میرا یہ مراسلہ پہنچے تو فوراً اھل الذمہ میں سے ان تمام لوگوں کا جزیہ معاف کردو جو دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔

امام ابو یوسف نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کا مذکورہ مراسلہ (بنام عبدالحمید بن عبدالرحمٰن) دوسرے انداز میں بیان کیا ہے نیز مزید حقوق بھی بیان کیے ہیں۔آپ اس مراسلہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

علماء اہل کوفہ میں سے ایک استاذ نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کے پاس حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ہاں سے ایک خط آیا تھا (جس کا مضمون یہ تھا کہ)تم نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ حیرہ کے کچھ یہودی عیسائی اور مجوسی اسلام لا رہے ہیں جن پر بہت کافی جزیہ عائد ہوتا رہا ہے۔اب ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے ؟تم نے ان سے (حسب سابق) جزیہ وصول کرنیکی اجازت چاہی ہے ۔اللہ جل شانہ نے حضرت محمد ﷺ کو داعی بنا کر بھیجا تھا نہ کہ محصل بنا کر۔ان مذاہب کے پیروؤں میں سے جو لوگ اسلام لے آئیں ان کے ذمہ اپنے مال کی زکوۃ ہو گی ۔ان پر جزیہ نہیں عائد ہوگا ۔ان کی میراث ان کے (غیر مسلم) رشتہ داروں کو ملے گی۔ان کے درمیان وراثت کی تقسیم اسی طرح ہو گی جس طرح مسلمانوں کے درمیان ہوتی ہے۔اگر اسکا کوئی وارث نہ ہوتو اس کا ترکہ مسلمانوں کے بیت المال میں داخل کر دیا جائے گا جس کا مال سارے مسلمانوں کے درمیان تقسیم ہوتا ہے ۔اس شخص سے اگر کوئی خیانت سرزد ہو جائے تو اس کی دیت بھی اللہ کے اس مال سے ادا کی جائے گی جو سارے مسلمانوں کے درمیان تقسیم کیا جاتا ہے۔والسلام"۔(۲۶)

عقد ذمہ اور جزیہ کی مشروعیت کی حکمت میں درج بالا تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بڑی غرض و غایت تو یہی ہے کہ اھل الذمہ/غیر مسلم اقلیتوں کو اسلام قبول کر کے دائمی نجات پانے کا موقع فراہم کیا جائے ۔تاہم اسکے علاوہ چند ضمنی مقاصد کی طرف بھی ہمارے فقہاء نے اشارہ کیا ہے ۔صرف اشارہ ہی نہیں اسکی تفصیل بھی بتائی

ہے مثلاً یہ کہ جزیہ دینا اس بات کی علامت ہے کہ اس غیر مسلم فرد یا قوم نے اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کر لی ہے۔ دوسرے جزیہ غیر مسلم افراد کو ہر قسم کے استحصال اور ظلم و زیادتی سے بچانے کا موثر وسیلہ ہے۔ تیسرے اسلامی ریاست کے لیے ایک آمدن کا ذریعہ ہے جسے وہ مصالح عامہ اور رعایا کی بنیادی ضروریات پر خرچ کرتی ہے۔ (۲۷)

عقد ذمہ کی شرائط

عقد ذمہ کی شرائط کے ضمن میں بھی فقہاء اسلام نے خاصی تفصیلات ذکر کی ہیں مثلاً بعض فقہاء اور علماء سیاست نے عبدالرحمٰن بن غنم اور اھل الجزیرہ کے درمیان طے پانے والے اس معاہدے کو درج کیا ہے جسکی منظوری عبد الرحمٰن بن غنم نے خلیفہ المسلمین حضرت عمر فاروقؓ سے حاصل کی۔ (۲۸) اس معاہدہ میں اسلامی حکومت کی بجائے خود اھل الجزیرہ نے اپنے حوالے سے بہت سی شرائط اور پابندیاں قبول کی ہیں۔

اسی طرح علامہ قرافی نے ''الفروق'' کے جز ثالث میں ۱۱۸ ویں فرق کے تحت اس مسئلہ میں کوئی پانچ چھ صفحات پر مشتمل بیسیوں شرائط بیان کی ہیں۔ پھر ان شرائط کو تین اقسام میں تقسیم کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ کن شرائط کو پورا نہ کرنے سے عقد ذمہ ٹوٹ جائے گا اور کن سے نہیں ٹوٹے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ (۲۹)

علاوہ ازیں دیگر فقہاء نے بھی اس مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے اور اپنے اپنے انداز میں عقد ذمہ کی شرائط بیان کی ہیں۔ تاہم ان میں اکثر شرائط وہ ہیں جن کا آج کے زمانے میں تصور یا ان پر عمل ممکن نہیں۔ لہٰذا اس مسئلے میں علامہ ماوردی نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہمارے نزدیک مختصر اور جامع ہے دوسرے اس سلسلے میں بعض شرائط پر جو شبہات اور اعتراض وارد ہوتا ہے (جس پر تفصیلی گفتگو آگے آئے گی) اس کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ لہٰذا ہم اسی کو یہاں نقل کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔

چنانچہ علامہ ماوردی نے الاحکام السلطانیہ کے تیرھویں باب میں جزیہ کی تفصیلات (مثلاً جزیہ اور خراج میں کتنی جہتوں سے اتحاد اور کتنی جہتوں سے فرق ہے، آیت جزیہ کی تفسیر، کن غیر مسلموں سے عقد ذمہ ہوسکتا ہے اور کن سے نہیں، کن اھل الذمہ سے جزیہ وصول کیا جائے گا اور کن سے معاف ہوگا، جزیہ کی مقدار وغیرہ) بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''جزیہ'' کے ساتھ دو شرطیں اور قابل لحاظ ہیں ایک ضروری اور دوسری غیر ضروری۔

ضروری شرط میں چھ امور داخل ہیں۔

۱۔ کتاب اللہ (قرآن مجید) پر کسی قسم کے طعن یا اس میں تحریف کے مرتکب نہ ہوں۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ کی تکذیب وتوہین نہ کریں۔

۳۔ دین اسلام کی مذمت اور اس پر اعتراضات نہ کریں۔
۴۔ مسلمان عورت سے زنا کے مرتکب ہوں نہ اس سے نکاح/شادی کا نام لیں۔
۵۔ کسی مسلمان آدمی کو مذہب سے ورغلائیں نہ اسکے مذہب و مال سے کوئی تعرض کریں۔
۶۔ اہل حرب کی اعانت نہ کریں اور نہ ان کے دولتمندوں سے راہ ورسم رکھیں۔

یہ چھ امور بلا شرط کیے بھی واجب العمل ہیں۔شرط محض اطلاع اور عہد کی تاکید وتغلیظ کیلئے کی جاتی ہے۔ شرط کے بعد اگر ان میں سے کسی امر کی پابندی نہ کی گئی تو عہد ٹوٹ جائے گا۔
غیر ضروری شرط میں بھی چھ امور داخل ہیں۔

۱۔ خاکی لباس اور زنار پہن کر اپنی ہیئت ممتاز رکھیں۔
۲۔ اپنی عمارتیں مسلمانوں سے بلند نہ کریں۔زیادہ سے زیادہ مساوی رکھیں۔
۳۔ اپنے ناقوس اور اپنی کتابوں کی آواز مسلمانوں کو نہ سنائیں نہ انہیں حضرت عزیر و مسیح علیہما السلام کی بابت اپنے خیالات بتائیں۔
۴۔ علی الاعلان شراب نوشی کریں نہ صلیبوں اور خنزیروں کا اظہار کریں۔
۵۔ اپنے مردوں کو خاموشی سے دفن کریں شور اور نوحہ نہ کریں۔
۶۔ عمدہ اور اصیل گھوڑوں پر سوار نہ ہوں۔خچروں اور گدھوں پر سوار ہونے کی ممانعت نہیں ہے۔(۳۰)

علامہ ماوردی کے مطابق یہ چھ امور داخل معاہدہ نہیں۔شرط کرنے سے لازم ہوتے ہیں۔شرط کے بعد ان کے ارتکاب سے نقض عہد لازم نہ آئے گا۔مگر تادیبا مواخذہ اور گرفت ضرور کی جائے اور شرط نہ کی گئی ہو تو مواخذہ بھی نہ کیا جائے۔(۳۱)

حوالہ جات وحواشی

(۱) مودودی، ابوالاعلیٰ: اسلامی ریاست اسلامک پبلکشنز لاہور ۱۹۸۷ء ص ۴۸۳

(۲) مقالات گیلانی (مقالہ: مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام)، شیخ زاید اسلامک سنٹر جامعہ پنجاب لاہور 2004ء ص: ۳۹۴۔۳۹۵

(۳) دیکھئے: ابن منظور، لسان العرب، دار صادر بیروت ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء ۱۲/ ۲۲۱۔

(۴) دیکھئے: اردو دائرہ معارف اسلامیہ (لفظ ذمہ)، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۰/ ۲۵۔

(۵) تھانوی، محمد اعلیٰ (م ۱۱۹۱ھ) کشاف اصطلاحات الفنون، سہیل اکیڈمی لاہور ۱۴۱۳ھ ۱۹۹۳ء/ ۱/ ۵۱۶

(۶) ابن منظور افریقی: لسان العرب ۱۲/ ۲۲۱

(۷) مصدر سابق

(۸) لویس معلوف، المنجد فی اللغۃ (مادم ذمم) دار المشرق بیروت ۱۹۸۸ ص ۲۳۷

(۹) بخاری: الجامع الصحیح کتاب المناقب باب قصۃ البیعۃ والاتفاق علی عثمانؓ، ابو یوسف کتاب الخراج ص ۱۴

(۱۰) بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع۔ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی ۱۴۰۵ھ ۷/ ۱۱۲۔۱۱۳

(۱۱) مودودی، ابوالاعلیٰ: اسلامی ریاست، اسلامک پبلیکیشنز لاہور ص ۴۸۳

(۱۲) اصلاحی، امین احسن، اسلامی ریاست، دار التذکیر اردو بازار لاہور، ۲۰۰۶ء، ص: ۲۰۰، ۲۰۱

(۱۳) اسلامی ریاست ص ۵۵۳۔۵۵۴۔

(۱۴) بنیادی حقوق، ادارہ ترجمان القرآن لاہور (ص ۹۵۔۹۶)

(۱۵) ابن نجیم زین الدین بن ابراہیم (م ۹۷۰) الاشباہ والنظائر، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی ت۔ن ۱/ ۱۱۸۔

(۱۶) تفصیل کیلئے دیکھئے بخاری، الجامع الصحیح مع شرح کرمانی (کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء) داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء ۱۶/ ۱۱۷، رقم ۳۹۶۶۔

(۱۷) دیکھئے امام ابو یوسف، کتاب الخراج ص ۱۲۰۔۱۲۱، ابو عبید قاسم بن سلام، کتاب الاموال (باب نمبر ۷۷۔ پیرہ نمبر ۱۶۹۳ تا ۱۷۰۳) ص ۷۹۴ تا ۷۹۸۔

(۱۸) کتاب الاموال (پیرہ نمبر ۱۶۹۹) ص ۷۹۶، ۷۹۷۔

(۱۹) کاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی ۱۴۰۰ھ ۷/ ۱۱۱

(۲۰) ابن العربی، ابوبکر محمد بن عبداللہ، احکام القرآن، داراحیاء الکتب العربی ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۷ء ۲/ ۹۱۳

(۲۱) کاسانی، بدائع الصنائع ۷/ ۱۱۱۔

(۲۲) سرخسی شمس الائمہ محمد بن احمد بن ابی سہل: شرح السیر الکبیر، دار المعارف النظامیہ حیدر آباد دکن ت ن ۳/ ۲۴۹۔۲۵۰۔

(۲۳) قرافی، الفروق (۱۱۷واں فرق) ۳/۲۱-۲۲۔

(۲۴) علامہ جصاص رازی نے اس مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلے میں وارد ہونے والے تمام شبہات کا جواب دیا ہے۔ دیکھیے حصاص ابوبکر احمد الرازی، احکام القرآن ۳/۱۴۸-۱۴۹ نیز دیکھیے کاسانی بدائع الصنائع ۷/۱۱۲۔ شعرانی، المیزان لکبری (اردو ترجمہ) ۳/۳۶۴۔ السید سابق فقہ السنۃ ۲/ ۶۶۸۔ امام ابو یوسف کتاب الخراج (اردو ترجمہ) (پیرہ نمبر۵۸۲) ص ۳۹۸-۳۹۹۔

(۲۵) الجصاص، علامہ ابوبکر: احکام القرآن، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۳/۱۰۵۔

(۲۶) کتاب الخراج (اردو ترجمہ بنام اسلام کا نظام محاصل، از ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی) مکتبہ چراغ راہ راچی ۱۹۶۶، ص ۳۹۸-۳۹۹۔

(۲۷) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو، الموسوعة الفقهية کویت ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۵ء (تحت لفظ جزیہ) ۱۵/ ۱۵۷ تا ۱۶۰۔

(۲۸) ملاحظہ ہو: ابویعلی: احکام السلطانیہ، مصطفیٰ حلبی مصر ۱۳۵۷ھ ص ۱۴۲، ۱۴۳ اوزارۃ الاوقاف والشؤن الاسلامیہ، الکویت: الموسوعة الفقهية۔

(۲۹) قرآفی ابوالعباس احمد بن ادریس۔ الفروق، ۳/ ۲۳ تا ۲۸۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆